ABSTRACTS

The Study of letters published in "Funoon".

The literary journal "FUNOON" is included in the most important journals in Urdu. It's vital part, consisting letters from the readers is named as 'Differences and impressions". This portion of the journal is highly valued. This part includes the opinion of the readers. Most of the writers of letters are editors and literary scholars that is why celebrated prose style is reflected in it. Several other notable researchers, scholars and critics have also written and commented on the literary importance of this journal. Invariably all the mainstream writers, critics and poets have contributed to this section of the Journal. These contribution have enriched Urdu Criticism.

محمد افضل جاوید
سیّد جاوید اقبال

مجلّہ ''فنون'' میں شائع ہونے والے قارئین کے خطوط کا مطالعہ

ادبی رسائل و جرائد اور مجلّات کسی بھی زبان کی ادبی، تنقیدی اور تحقیقی تاریخ میں نہ صرف بنیادی کردار ادا کرتے ہیں بلکہ زبان وادب کے فروغ میں مرکزی کردار ادا بھی۔ رسالہ "فنون" کا شمار ایک ایسے ہی ادبی رسائل میں ہوتا ہے۔ اسے بھی اُردو زبان وادب کی ترویج کے لیے ۱۹۶۳ء میں جاری کیا گیا اور اب تک اس کا سفر جاری ہے۔

اردو کے رسائل میں قارئین کے خطوط کی اشاعت بھی موجودہ دور میں تو ایک جزو بن چکی ہے۔ عام ادبی رسائل میں یہ حصہ ''قارئین کے خطوط'' کے نام سے شائع ہوتا ہے لیکن ''فنون'' میں شروع سے ہی اس گوشے کا نام ''اختلافات وتاثرات'' ہے۔ غالباً مدیر کے پیشِ نظر یہ بات تھی کہ قارئین کو یہ باور کروایا جائے کہ اُنھیں اپنے تاثرات کے اظہار کی مکمل آزادی ہے۔

کسی بھی شائع ہونے والے فن پارے پر تنقید کرنا تو قاری کا حق ہوتا ہے اگر قاری کسی فن پارے کو پسند کرتا ہے تو اسے اس کی داد دینے کا بھی پورا حق ہے اور اگر کسی فن پارے میں کوئی کمی محسوس کرتا ہے تو بھی اسے حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کر سکے۔ اختلافات وتاثرات کے اس اظہار کو قارئین نے بہت اہمیت دی اور ''فنون'' کے مدیر نے بھی۔ اس طرح یہ سلسلہ مستقل مزاجی سے جاری ہے، قارئین اور مدیر دونوں نے اس مجلّے کا معیار ادبی حوالے سے بلند کیا اور آہستہ آہستہ یہ سلسلہ تنقیدی دبستان

میں تبدیل ہوگیا۔

گوشہ ''اختلافات وتاثرات کی اہمیت اوراس کی تنقیدی افادیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے آصف ثاقب لکھتے ہیں کہ:

> ''میں نے ایک مرتبہ اس وسیلے سے بات کی تھی کہ ''فنون'' کے مطالعے کا یہ حصہ 'سچ پوچھئے' تو ایک مخصوص تنقیدی دبستان کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ یہاں ردوقبول کے باب میں "ذاتی اور غیر ذاتی" دلائل کے مہیا کرنے کا عمل ازحد پسندیدہ ہے۔اس "مشغلے" میں نہ تو اتنا شور ہے کہ کان پڑی آواز بھی سنائی نہ دے اور نہ اتنا سہم ہے کہ منہ پر پھپھوندی لگ جائے۔مسائل کے چھیڑنے سے فنی رموز کھلتے ہیں، بات سے بات بڑھتی ہے۔''[1]

''اختلافات وتاثرات'' میں ادبی فن پاروں پر ابتدائی طور پر تنقیدی بحث کا آغاز کیا جاتا ہے۔''فنون'' کے ہر آنے والے شمارے میں، گزشتہ شمارے میں شائع ہونے والے بیش تر فن پاروں کے بارے میں قارئین کی آرا کو شامل کیا جاتا ہے۔اس سے جہاں تنقیدی مباحث کا آغاز ہوتا ہے وہیں گذشتہ شمارے کے مندرجات سے بھی آگاہی کا سلسلہ باقی رہتا ہے۔''فنون'' میں لکھنے والوں کی تعداد خاطر خواہ ہے۔جن میں سے بہت سے لکھنے والے پختہ کار اور کہنہ مشق ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جنھوں نے اس کاروانِ قلم میں شمولیت حاصل کرنے کے بعد نام پیدا کیا۔اسی طرح قارئین کے ادبی ذوق کو پروان چڑھانے، اُن کی رائے کو اہمیت دینے اور اظہار کا موقعہ فراہم کرنے میں ''فنون'' نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

''اختلافات وتاثرات'' میں لکھنے والے بھی اہم لوگ ہیں جن میں سے سب کو احاطۂ تحریر میں لانا مشکل ہے۔لیکن جن افراد نے اس حصے میں تسلسل کے ساتھ حصّہ لیا ہے ان میں سے بھی کچھ اہم افراد کے نام درج ذیل ہیں:

آصف ثاقب، آغا افتخار حسین، اے۔بی۔اشرف، امتیاز علی خان، ارشد نعیم، اسلم کمال، افتخار مغل، اصغر وسیم، اصغر اقبال، انور سدید، اشفاق بخاری، اقبال ناظر، انور جاوید ہاشمی، انوار احمد، الطاف فاطمہ، ام عمارہ، ارجمند رفیق، آفتاب اقبال شمیم، احمد فقیہہ، افشاں زوار، اسومان بیلن اوزکان، ارشد صدیقی، اظہر کاظمی، ادیب سہیل، اقبال منہاس، امجد الطاف، احمد نواز ملک، امتیاز الحق امتیاز، ارشد جاوید، احمد حسین مجاہد، امجد اسلام امجد، ارشد عروج، اسلم سراج الدین، ارشاد متین، افسر ساجد، ارشاد علی، اشرف عدیل، الیاس عشقی، ارشد محمود ناشاد، بلراج میر، پروین زیدی، پروین شاکر، تسنیم اختر، تاثیر وجدان، تنویر سپرا، جابر علی سید، جمیل یوسف، جمال نقوی، جاوید بسام، جاوید انور، حسین مجاہد، حامد سراج، حسین اختر، حسین شاد، حبیب اسد علی خان، حنیف فوق، خاور نقوی، خواجہ منظور حسین، خالد اقبال یاسر، خالد قیوم تنولی، خورشید بیگ،، خالد احمد، خورشید جاوید، خلیل رام پوری، خیر الدین انصاری، خالد مصطفیٰ، خالد خواجہ، دستگیر شہزاد، رضا ہمدانی، رفعت مرتضیٰ، ریاض حسین چودھری، سید ریاضی حسین، رضیہ فصیح احمد، رحیم انجان، رشیدہ رضویہ، رحمان فراز، رشید ملک، رانا غلام شبیر، زاہد فارانی، زید اللہ فہیم، سیتہ پال آنند، سلیم اختر، سید منیر، سلطان سکون، سلطان فریدی، سید عارف، سجاد بابر، سہیل احمد خان، شہاب صفدر، شہزاد منظر، شریف الدین اشرف، شفیع ضامن، شریف کنجاہی، شاہد جمشید، شاہدہ یوسف، شمیم حنفی، شوکت مہدی، شعیب آفریدی، صوفی عبدالرشید، صابر ظفر، صلاح الدین حیدر، صابر آفاقی، طارق ہاشمی، طاہر تونسوی، طالب انصاری،

ظہیر فتح پوری، ظفر سپل، عامر سہیل، عبدالقیوم، عرفان احمد عرفی، علی عباس جلالپوری، علی تنہا، عبداللہ جاوید، عبدالرحیم انجان، عابد شفیق، عابد ودود، عمیق حنفی، عطاالحق قاسمی، عبدالعزیز خالد، عزیز حامد مدنی، فاروق مونس، فروغ احمد، فہمیدہ ریاض، فوزیہ چودھری، فاروق خالد، قیوم راہی، قیصر تمکین، قاسم جلال، قیصر نجفی، کبیر بسمل، گلزار، گلزار بخاری، مشتاق احمد، منو بھائی، منصورہ احمد، محسن بھوپالی، مشکور حسین یاد، محسن علی شمسی، محمد امین، مصطفیٰ کریم، محمد انیس انصاری، میجر شہزاد نیئر، محمد ارشاد، مظہر محمود شیرانی، مسعود مفتی، محمد فیروز شاہ، محمد سلیم بھٹی، محمد اشفاق، محمد کاظم، ناہید قاسمی، نعیم الرحمٰن، نگہت مرزا، نجیب عمر، ناصر بشیر، ندیم نازی، نور محمد، قادری، ہارون الرشید، یوسف حسن، یوسف علی لائق، اور یٰسین بسمل وغیرہم۔

مذکورہ گوشے میں چوں کہ بعض اہلِ علم کسی علمی و ادبی مسئلے پر اپنے خیالات دیگر قارئین کو پہنچانا چاہتے ہیں تو اُس مسئلے پر وہ کوئی مقالہ یا مضمون نہیں لکھتے بلکہ مدیر کو خط تحریر کرتے ہیں، جسے مدیر شائع کر دیتا ہے اُس کے بعد قارئین اُس خط کے جواب میں اپنی اپنی آراء خط کے ذریعے مدیر کو بھیج دیتے ہیں، اس طرح مکتوباتی مذاکرہ ہو جاتا ہے جو معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ قارئین کے لیے دل چسپی کا باعث بھی ہوتا تھا۔ "اختلافات وتاثرات" کی اسی خوبی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے محمد شہزاد نیئر رقم طراز ہیں:

> ''اختلافات وتاثرات کے صفحات بہت سا علمی و ادبی مواد سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس بار بھی بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوئیں بالخصوص یوسف حسن، عبدالقیوم فاروق مونس، اے۔ بی۔ اشرف، ظفر سپل اور عامر سہیل کے مکتوب فکر ونظر کے کئی در وا کر گئے۔''[۲]

تھوڑے سے صفحات پر مشتمل تجزباتی تبصرے کو پڑھ کر قاری کے ذوق کی تسکین ہو جاتی ہے اس حوالے سے ارشد جاوید لکھتے ہیں کہ: ''فنون کا حصہ اختلافات وتاثرات ایک عطر بیز ماحول کا تاثر پیدا کرتا ہے۔''[۳]

''فنون'' کے مذکورہ گوشے کی انھیں خوبیوں کی جانب متوجہ کرتے ہوئے خالد قیوم تنولی رقم طراز ہیں کہ: ''اختلافات وتاثرات'' (خطوط) کے گوشے میں بیش تر مکتوبات اور تبصرے خاصے کی چیز ہیں۔''[۴] قارئین چوں کہ مختلف طبائع کے حامل ہوتے ہیں لہٰذا وہ اپنی اپنی انفرادی سوچ کے مطابق مشورے دیتے ہیں۔ مثلاً سہیل احمد خان ''فنون'' میں تنقیدی بصیرت کے حامل مضامین کے حق میں ہوتے ہیں محض نظموں کے انبار لگا دینا کافی نہیں سمجھتے وہ ادبی شعور کو اجاگر کرنے کے لیے تجزباتی طریقہ کار کے قائل ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ: ''فنون'' کا تازہ شمارہ کچھ بے قابو سا دکھائی دیتا ہے... یوں نظموں کے انبار چھاپتے رہنے سے بات نہیں بنتی۔ دراصل ہمارے ہاں چیزوں کے باطن میں چھپے ہوئے اسباب کا تجزیہ کرنے کی بجائے سہل الحصول کی طلب زیادہ ہے۔''[۵]

اسی طرح وسیم عباس اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

> ''اختلافات کا کالم یقیناً بے حد دل چسپ ہوتا ہے اور پڑھنے والا اس کے مطالعے سے بہت کچھ سیکھتا ہے مگر کیا یہ ''اختلافات'' کچھ زیادہ طول نہیں کھینچے جا رہے؟ تازہ شمارے کے سولہ صفحات کے "اختلافات" پر صرف دو اصحاب کا قبضہ، دونوں ہمارے محترم ہیں اور جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ بھی علمی لحاظ سے گراں بہا ہے۔ مگر ان کے

مفصل ارشادات نے مجھ جیسے کتنے مختصر نویسوں کی صریح حق تلفی کی ہے۔''[۲]

قارئین کے یہ خطوط نمائشی نہیں ہیں اور نہ ہی اپنی ریٹنگ میں اضافہ کرنے کا ذریعہ ہیں بلکہ سنجیدہ قارئین اس سلسلے سے اس قدر مانوس ہو چکے ہیں کہ نہ تو اس گوشے کے نام کی تبدیلی کو گوارا کرتے ہیں اور نہ ہی ان کی جگہ کی تبدیلی کو اور اگر کبھی اس گوشے کے نام یا رسالے میں جگہ کی تبدیلی کا ذکر ہوتا بھی ہے تو قارئین اس عمل پر احتجاج کرتے ہیں۔اس ضمن میں افتخار مغل نے نہ صرف ''اختلافات وتاثرات'' کی اہمیت کو نہ صرف قابلِ ستائش ٹھہرایا بلکہ انھوں نے اسے مخالفت اور موافقت کی بنا پر انقلاب کی روح قرار دیا ہے۔وہ رقم طراز ہیں کہ:

> ''اختلافات کے نام اور ان کی پلیسمنٹ" کی تبدیلی سے ابھی تک کمپرومائز نہیں کیا جا سکا۔''اختلافات'' کے نام میں کچھ ایسا سحر ہے کہ اب اس لفظ کے گرد اس کی روایت کے تلازمات کی پوری ایک ''گلیکسی" گردش کرتی نظر آتی ہے۔اس لفظ میں اپنی مخصوص کلاسیکیت کے علاوہ بھی شاید ایسا کچھ ضرور ہے کہ اس پر ''اختلافات'' ہی کا نام سجتا ہے۔''اختلافات''۔۔۔جس میں چیلنج بھی ہے اور روح انقلاب بھی، انحراف بھی ہے اور اعتراف بھی، مخالفت بھی ہے اور موافقت بھی ہے۔''اختلافات'' کی ایک جہت ''اعترافات'' بھی ہے مختصر یہ کہ اگر ''اختلافات'' میں محض اختلافات ہی ہوں (جو نہیں ہوتے) تب بھی اختلافات میں اعتراف کی ایک جہت تو بہر حال موجود ہے، اس ضمن میں ''فنون'' کی ایک معتبر آواز جناب آصف ثاقب نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ ''اختلافات'' کا عنوان جو نقد معنوی کی ایک حیرت انگیز روایت میں، ڈھل چکا ہے۔اپنی جگہ تنقیدی قدروں کی جان پہچان ہے۔''[۳]

قارئین کا وہ حلقہ جو ''فنون'' کا تسلسل کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے وہ اس گوشے کی تنقیدی آراء کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ان کے خیال میں یہ ایک مربوط سلسلۂ تنقید ہے ایسے مدوّن کرنے کی ضرورت ہے۔اس لیے کہ اس کی تدوین سے خاطر خواہ نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

ان تمام آرا کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ''فنون'' میں قارئین کے شائع ہونے والے خطوط اپنی اہمیت وافادیت کے اعتبار سے کتنے اہم ہیں۔اس میں ادبی فن پاروں پر تنقیدی آرا بھی ملتی ہیں اور تفہیم وتجزیہ بھی پایا جاتا ہے۔

ادبی رسائل میں شائع ہونے والے خطوط کئی حوالوں سے اہم ہیں خاص کہ قارئین کے یہ خطوط اظہارِ رائے کے حوالے سے قابل قدر ذخیرہ ہیں اور خاص ادبی حیثیت کے حامل بھی۔ ہر شاعر اور ادیب اپنا ایک خاص اسلوب رکھتا ہے جو اس کی شاعری اور نثر دونوں میں جھلکتا ہے۔اس کی تحریروں کی خوبیوں کا عکس صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔کس فن کار کو اپنے الفاظ پر کتنی گرفت ہے؟ اور وہ اظہار کے لیے لفظوں کا انتخاب کیسے کرتا ہے۔جملوں کی ساخت، الفاظ کا چناؤ، تراکیب کا استعمال و دیگر لوازماتِ تحریر کو کس فنی چابک دستی سے استعمال کیے گئے ہیں یہ تمام خوبیاں اور خامیاں ان خطوط میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔خاور نقوی جب ''فنون'' میں شائع شدہ چند نظموں کے حوالے سے بحث کرتے ہیں تو نہ صرف نظموں سے آگاہی ہوتی بلکہ افتخار مغل کی تحریروں میں ادبی شعور کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''ضیا جالندھری نے اپنی نظم ''شوریدہ'' میں فن کار کے اضطراب کو مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس نظم میں رواں بحر اور قوافی کے استعمال نے نغمگی کی دلاویز فضا کو جنم دیا ہے۔ زہرہ نگار نے نظم ''سنا ہے'' میں اس نکتے کو بڑی عمدگی کے ساتھ واضح کیا ہے کہ جب انسان وحشت اور درندگی پر اترتا ہے تو درندوں کو مات کر دیتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں جنگل کے قانون کے نفاذ کی خواہش کتنی بڑی سچائی بن کر سامنے آتی ہے۔ خورشید رضوی نے عمر عزیز کی برق رفتاری کو موضوع بنا کو سالگرہ جیسی ظاہری مسرت افزا نمائش کے تناظر میں ایک منفرد زاویہ نگاہ پیش کیا ہے۔''[۸]

تحریر شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ مسعود مفتی اردو میں ایک ایسے ادیب کے حیثیت سے جانے جاتے ہیں جن کا اسلوب قارئین کو اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے۔ ان کی شخصیت اپنے اندر ڈھلتی عمر کے ساتھ عجز کے پہلو کو بھی نمایاں کرتی ہے ان کا تحریر کردہ یہ خط بھی اس بات کی غمازی کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''...''فنون'' کا شمارہ ۱۳۰ ملا۔ شکریہ۔ یہ میرے لیے دو خوشیاں لایا۔ پہلی خوشی اپنی شرکت سے ہوئی۔ چاہے وہ ماضی کی بازگشت ہی تھی اور دوسری خوشی شمارے کی پھبن سے ہوئی کہ ابتدائی لڑکھڑاہٹ کے بعد اب یہ سنبھل گیا ہے۔ اور ان شاء اللہ سابقہ آب و تاب بھی جلد ہی طلوع ہو گی۔ اس کے مندرجات کا مطالعہ تو اسی اطمینان سے کروں گا جس کا یہ حقدار ہے مگر آپ کی محنت اور ہمت کی داد بھی پیش کر رہا ہوں جس کا حصہ نیر حیات قاسمی صاحب بھی ہیں۔ ''فنون'' کے پرانے پرچوں سے میرے مضمون کا اقتباس شائع کرنے کا شکریہ۔ (اب یہ میری کتاب ''لمحے'' میں شامل ہے) مگر اس میں میرے لیے شرمندگی کا یہ پہلو بھی ہے کہ آپ سے وعدے کے باوجود اس شمارے کے لیے تازہ تحریر نہ بھیج سکا۔ وجوہات کئی ہیں۔ کچھ تو نئی کتابوں کی ترتیب کی وجہ سے ہے مگر ہر چیز پر حاوی حقیقت یہ ہے کہ آج کل سو فیصدی زندگی گزارنے کی بجائے اتنی ہی سمیٹتا ہوں جتنی عمر کی بندگی اجازت دیتی ہے۔''[۹]

''فنون'' میں شائع ہونے والے قارئین کے خطوط اور ان کا اسلوب، اُن خطوط سے مختلف ہے جو روزمرہ میں لکھے جاتے ہیں اور ان کی خوبی یہ ہے کہ بظاہر تو خطوط ہیں لیکن چوں کہ ادبا اور شعرا کے تحریر کردہ ہیں اس لیے ان خطوط میں ادبی رنگ ملتا ہے۔ مثلاً محمد فیروز شاہ کا تحریر کردہ خط اس حوالے سے اچھی مثال ہے:

''فنون'' ۱۲۲، ملا اور عید کا مزا دوبالا ہو گیا! آپ کے اداریے نے قندِ مکرر کا مزہ دیا۔ شہد جتنا پرانا ہوا تنا ہی لذیز اور مفید ہوتا ہے۔ خلوص اور محبت کے خمیر میں گندھ کر تخلیق ہونے والے ہر لفظ کے ضمیر میں روشنی چمکتی ہے۔ روشن ضمیر لفظوں کی جاگیر سبھی کو نصیب نہیں ہوتی اس کے لیے اخلاص بھری عمروں کے نذرانے وقت کے ادوار میں پیش کرنا پڑتے ہیں تب کہیں جا کر حرفوں میں روشنی آتی ہے اور سطروں کے درمیان میں سے اولین گلاب کی خوشبو نکھار بانٹتی لہر اٹھاتی محسوس پڑتی ہے۔ سر پر بلند تحریر کی توقیر نا معتبر لمحوں کی دھول سے کبھی رفاقت نہیں کرتی... یہ تو راستہ ہی کوئی اور ہے۔ اعتبار اور اعتماد تو صدق و صفا کے معیار کا ہم سفر ہونے سے ملا کرتا ہے۔ اور سچائی محبت کی توانا کمک لے کر

آگے بڑھا کرتی ہے۔ دانش سچے لوگوں کے سینوں اور عملوں میں نور بھرتی رہتی ہے اور لوگ دانائی کا سرور آنے والی نسلوں میں ایک ناقابلِ تسخیر قوت کی طرح ظہور کرتا ہے۔ تو کامران حرفوں کی کہکشائیں تخلیق ہوتی ہیں۔ یہ زمین پر آسمان کی رفعتیں اتر آنے کی ساعتیں ہوتی ہیں جو کسی ایسے قلم کار کی نوائے کاملہ میں رنگ بھرتی ہیں جس نے عمر بھر محبتوں کو رواج دینے کا قرینہ اپنے مزاج کا وتیرہ بنا لیا ہو اور ایسا صرف وہی کر سکتا ہے جسے کشیدگیوں کو کشادگیوں میں بدل دینے کا ہنر ودیعت ہوا ہو... قلم تو محبتوں کا علم ہوتا ہے پھر اسے بے جا تعصّبات کا سفیر بنا کر الم کو رواج کیوں دیا جائے۔'' [۱۰]

ادب کے حوالے سے ممتاز کالم نگار اور ادیب منو بھائی کا ایک خط بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

''عہدِ حاضر کے بدنصیب تو وہ ہیں جو کہ فکر کی پگڈنڈی عبور کرنا چاہتے ہیں اور دھند کے پتھر مٹانے کی سعی لاحاصل میں اپنی زندگی ضائع کر دیتے ہیں۔ خوش نصیب تو کوہِ فکر کا راستہ ہی اختیار نہیں کرتے۔ چنانچہ کسی بھی صدی کے صدر دروازے سے گزرنے کے لیے انھیں اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ تو عدالتِ وقت کی سزا سن کر بھی سنی ان سنی کر دیتے ہیں۔ یا ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتے ہیں۔ جن کی یہ بے نیازی اُس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک کہ "بلیک وارنٹ" نہیں آ جاتے کہ اس کے بعد فاصلہ بہت کم رہ جاتا ہے۔'' [۱۱]

اردو ادبا کی فہرست میں سید مشکور حسین یاد کا نام بہت اہم ہے۔ ان کے بہت سے فن پارے ''فنون'' میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اپنے ان فن پاروں کی اشاعت سے قارئین میں پزیرائی حاصل کی بلکہ ''اختلافات وتاثرات'' میں بھی اپنی آرا شامل کرتے رہے ہیں۔ ایک موقعے پر ''بین السطور'' کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''بین السطور بات کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ سوچنے سمجھنے والا آدمی اس پر خصوصیت کے ساتھ غور کرتا ہے۔ بین السطور کا نقصان یہ ہے کہ اگر بات کرنے میں احتیاط سے کام نہ لیا جائے تو ساری بات ہی چوپٹ ہو کر رہ جاتی ہے۔ مثلاً ''فنون'' کا تازہ شمارہ نمبر ۱۳۰، جنوری تا جون، ۲۰۱۱ء کے بین السطور میں پہلی دو باتیں کہی گئی ہیں اور واوین، میں مطلب یہ ہے کہ یہ باتیں کسی دوسرے کی ہیں۔ چلئے تو وہ پہلی باتیں یہ نہیں کہ ''جو پائے اچھے ہیں یا دو پائے بُرے ہیں'' دوسری بات ہے ''جھوٹ سچ ہے اور سچ جھوٹ ہیں'' اور یہ لیجیے تیسری بات بھی نکل آئی "جنگ امن ہے اور امن جنگ ہے'' پہلی بات کے حوالے سے آپ آدمی کو دو پایا کہیں گے اور اگر وہ جھک کر پاؤں کے ساتھ اپنے ہاتھ بھی چلانے لگے تو پھر آپ اسے کیا کہیں گے۔ لیکن آدمی دو پایا سے چوپایا بن سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ چوپائے اس طرح دو پائے نہیں بن سکتے۔ مگر آپ تیز و تند قسم کے گھوڑے پر بیٹھیں تو وہ دو ٹانگوں پر بھی کھڑا ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ چوپائے اور دو پائے دونوں ہی اچھے برے ہو سکتے ہیں۔ اب دوسری بات کی طرف آیئے "اگر جھوٹ سچ ہے اور سچ جھوٹ ہے۔'' تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہاں کوئی سچ ہے اور نہ جھوٹ حالانکہ یہاں سچ ہی سچ ہے جھوٹ تو ہم اسے کہتے ہیں یا اس وقت کہتے ہیں جب سچ ہماری نظروں سے غائب ہو یا ہم میں سچ کو دیکھنے کی صلاحیت نہ رہی ہو۔ لیکن امن اور جنگ والا معاملہ یا تو فساد جھوٹ اور سچ کی طرح کا نہیں ہے۔ جنگ میں آپ کو دوسرے کی پٹائی بھی کرنی پڑتی ہے اور دوسرے سے پٹائی کھانی بھی پڑتی ہے۔ ویسے تضاد کا مطلب اس

کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ آپ زندگی میں غور وفکر سے کام لیں۔ غور وفکر کے بغیر آپ کا کسی وقت بھی پٹڑا ہوسکتا ہے۔ تضاد آپ کا پٹڑا نہیں کرتا بلکہ تضاد کی تو کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔ آپ کی عدم توجہی آپ کا بیڑا غرق کرسکتی ہے اور کر دیتی ہے۔''[۱۲]

ارشد عروج ''اختلافات و تاثرات'' میں مستقل خطوط لکھنے والوں میں سے اور ہیں۔ ان کے خطوط تنقیدی لحاظ سے بھی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ایک خط میں کہانی اور افسانے کے فرق کی بابت لکھتے ہیں کہ:

''افسانہ ایک ایسی صنف ادب ہے جس کی تازہ کاری اور تہہ داری کبھی ختم نہیں ہوسکتی کیوں کہ افسانے کا تعلق زندگی سے ہے۔ زندگی کی گوناں گونی اور بوقلمونی کی کوئی حد نہیں اس سلسلے میں لکھنے والوں کو ایک بات علی الخصوص یاد رکھنی چاہیے کہ ہر افسانے میں کہانی موجود ہوتی ہے۔ مگر ہر کہانی میں افسانے کا ہونا ضروری نہیں۔ کہانی اور افسانے کے فرق کو ہم بھٹہ خشت میں پکی ہوئی اینٹ اور کمہار کے آوے میں پکے ہوئے ظروف کی مثال سے سمجھ سکتے ہیں دونوں میں مٹی استعمال ہوگی۔ اسی طرح افسانہ نگار اپنی تیکنیکی اپج سے کہانی سے افسانہ تراشتا ہے۔''[۱۳]

قارئین کے خطوط میں بعض مسائل جو ادب کی ترویج میں رکاوٹ بنتے ہیں اور قدغن لگا کر ادب میں رکاوٹ بنتے ہیں ان پر بھی ادبی انداز میں قلم اٹھایا گیا ہے۔ یہ مباحث دلائل و براہین کے ذریعے ادبی راہ کو ہموار کرنے میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ ایسی ہی ایک کاوش جو مسئلے کے سلجھاؤ کے حوالے سے قرار دی جاسکتی ہے۔ اس خط کے اقتباس میں ملاحظہ کیجیے:

''ادب میں گروہ بندیوں اور اجارہ داریوں کا عفریت کتنے ہی زرخیز ذہنوں کو نگل چکا ہے اور تخلیق حسن کی کتنی ہی اسیرائیں حریم دیدہ و دل میں اترنے سے پہلے پہلے رزق زمین بن چکی ہیں۔ حسد اور منافقت کا زہر نوک قلم میں سرایت کر جائے تو سچے حروف بھی قصرانا کی غلام گردشوں میں سانس کھینچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں جذبے مہکنے کا ہنر کہاں سے سیکھیں گے۔ معاصرانہ چپقلش اور کاروباری رقابت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اپنے عہد کی دانش ہی اگر اخلاقی ضابطوں کی تمام حدود پھلانگ جائے تو پھر شریفانہ طرز عمل کی توقع کس سے رکھی جائے گی؟ شاید جاہ طلبی اور ہوس تشہیر ہمیں اپنا اشتہار آپ بننے پر مجبور کرتی ہے۔ ہم اس ''اعتماد'' سے جھوٹ بولتے ہیں کہ سچ بیچارا احساس کمتری کا شکار ہو کر منظر نامے ہی سے غائب ہو جاتا ہے۔ قتل گاہوں کا قیام کس کے اعمال نامے میں درج ہوگا؟ نیکی اور شرافت کب تک نیلام گھروں کی زینت بنے گی؟''[۱۴]

ادبی گروہ بندیوں اور بے بنیاد سہاروں سے ہٹ کر درست سمت کا تعین اور ایک ایسے معاشرے کی تخلیق جو لفظوں کی سچائی کا امین ہو، جو ضمیر کی آواز پر لبیک کہنے والوں کا ساتھ دے اور جو اپنے اندر کی روشنی پر اعتماد کرے۔ انھیں جذبات کی ترسیل کے حوالے سے ریاض حسین چودھری رقم طراز ہیں کہ:

''فنون'' قدم قدم پر سچائیوں کے آئینے سجا رہا ہے۔ کسی کا اپنا چہرہ ہی گرد آلود ہو تو کیا کیا جائے۔ ان گروہ بندیوں اور اجارہ داریوں کا طلسم بہر حال ٹوٹنا چاہیے۔ آج کا ادیب بھی ان گنت خانوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ وہ گھپ اندھیروں میں جگنوؤں کی تلاش کا تو متمنی ہے۔ لیکن اپنے اندر کی روشنی کی تلاش میں بوجوہ نہیں نکلتا۔ وہ اپنے لفظ

کی سچائی پر ایماں کیوں نہیں لاتا؟ ضمیر کی آواز پر کان کیوں نہیں دھرتا؟ لوگ بیساکھیوں کی تلاش میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو کیوں ضائع کر رہے ہیں؟ کیا وہ نہیں جانتے کہ بیساکھیوں کی مدد سے تھوڑی دور تک تو چلا جا سکتا ہے، باقاعدہ کسی دوڑ میں شریک نہیں ہوا جا سکتا۔ قوت برداشت سے محروم معاشرہ ہمیں اجتماعی خودکشی کے دہانے تک لے آیا ہے۔ ادیب بھی اسی معاشرے کا ایک حصہ ہے۔ آؤ سچے لفظ تخلیق کرنے کا منصب سنبھالیں۔ اپنے اندر روشنی کی قوت پر اعتماد کرنا سیکھیں اور افق عالم پر دائمی بشارتیں تحریر کر کے تاجدار کائنات حضور رحمت عالمؐ کے حضور گرامیؐ کے درِ عاطفہ سے رشتہ غلامی استوار کیے بغیر نہ تو ذہنوں کا زنگ اڑے گا اور نہ روحوں کا میل ہی دھویا جا سکے گا۔'' ۱۵؎

''اختلافات وتاثرات'' کے بعض خطوط تنقیدی نوعیت کے ہوتے ہوئے تو بہت سے تقریظی نوعیت کے بھی۔ مثلاً:

''منصورہ کی نظموں میں ایک ایسی نغمگی ہے جو روح کے تاروں پر ساز چھیڑ دیتی ہے۔ حالات ومسائل کی تھکن جو کئی روز سے بدن میں مقیم ہوتی ہے، منصورہ کی نظم پڑھ کر غائب ہو جاتی ہے۔ منصورہ کی نظموں کے لفظ جب روح کی ننگی شاخوں پر آ بیٹھے ہیں تو یہ شاخیں پھولوں سے لد جاتی ہیں۔ خزاں رت میں بہار کے جھونکے سے بڑی نعمت اور کیا ہوگی۔'' ۱۶؎

خطوط نویسی کی ادبی روایت کو اگر ملحوظِ خاطر رکھا جائے تو مشاہیر کے خطوط یک جا شائع کیے جاتے ہیں اور ان کی حیثیت متعین بھی کی جاتی ہے اس طرح سے اگر کسی ادیب اور شاعر کے لکھے ہوئے خطوط جو "فنون" میں شائع ہوتے رہے ہیں ان کو بھی یک جا کیا جائے تو بہتر انداز میں نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود متنوع خطوط، بھی مختلف زاویہ ہائے نظر سے دیکھے جا سکتے ہیں اور ان کی ادبی حیثیت متعین کرنے کے لیے مختلف شعرا اور ادبا کے خطوط ایک ہی جگہ رکھ کر مطالعہ کیے جا سکتے ہیں۔

''فنون'' میں شائع ہونے والے قارئین کے خطوط ہمیشہ ''اختلافات وتاثرات'' کے نام سے شائع ہوتے رہے ہیں اور اگر کبھی کسی موقع پر اس کے نام کو تبدیل کرنے کی کوشش بھی کی گئی تو اسے مدیر اور قارئین دونوں نے قبول نہیں کیا بلکہ ان کے نزدیک اس کا سب سے مناسب عنوان ''اختلافات وتاثرات'' ہی قرار دیا۔ دراصل عنوان اپنے اندر خود اتنی معنویت رکھتا ہے کہ جو خود بخود ہماری توجہ تنقید کی جانب گامزن کر دیتا ہے۔ کسی تحریر کو محض پڑھ لینا کافی نہیں ہوتا بلکہ پڑھ کر اسے ہضم کرنا اور پھر اس کے بارے میں اپنی رائے دینا ہر قاری کا کام نہیں ہوتا، اس کام کے لیے منجھے ہوئے قارئین کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے قارئین جن کا مطالعہ وسیع ہو اور وہ فنی و فکری رموز سے آشنا بھی۔ اسے قارئین جب کسی فن پارے کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس فن پارے پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ جہاں تک تاثرات کی بات ہے، اس میں تو ایک فن پارے کو پڑھ کر اس کے بارے میں اس قدر اظہار کر دینا کافی سمجھا جاتا ہے کہ یہ فن پارہ کیسا ہے؟ لیکن جب اختلافات کی بات آتی ہے تو اختلاف کرتے ہوئے قاری کو یہ وضاحت کرنا ہوتی ہے کہ کس وجہ سے اختلاف کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ انداز کسی فن کار کو گراں بھی گزر سکتا ہے لیکن اس سے نہ صرف اس فن پارے کا تخلیق کار سیکھتا ہے بلکہ بالواسطہ طریقے سے قارئین اور دیگر فن کار بھی راہ نمائی لیتے ہیں۔ بہرکیف علمی مباحث کا آغاز بھی خط سے ہوتا ہے اور انجام بھی خط پر ہوتا ہے

''اختلافات وتاثرات'' میں شائع ہونے والے خطوط جن اہم فکری اور فنی موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

فکشن: افسانہ، ناول، ڈراما، انشائیہ، سفرنامہ وغیرہم۔

شاعری: نظم، غزل، رباعی، وغیرہم۔

دیگر: اقبالیات، مضامین، مقالات، یاداشتیں، طنز ومزاح، تراجم وغیرہم۔

''اختلافات وتاثرات'' کا بنظرِ غائر جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس گوشے میں فن پارے کا فکری، فنی اور موضاعاتی حوالے سے بھی جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس رسالے میں افسانہ اور نظم کی تعداد دوسری اصنافِ ادب کے مقابلے میں زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ زیادہ جگہ بھی ان ہی کو حاصل ہوتی ہے گویا اس رسالے نے نظم اور افسانے کو پروان چڑھانے اور شعرا وادبا کو اس جانب گامزن کرنے میں قابلِ ذکر کردار ادا کیا ہے اور ادبی روایت کی آب یاری میں نئے انداز اور پرانے انداز دونوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

''اختلافات وتاثرات'' میں فکشن میں نمایاں مقام افسانے کا ہے۔ دورِ جدید میں جوں جوں انسان عدیم الفرصتی کا شکار ہوتا جارہا ہے تو وہ ایسی اصناف کی طرف متوجہ ہورہا ہے جس میں وہ کم وقت میں مطالعے کا شوق پورا کرسکے اور زندگی کے نئے اور اچھوتے تجربات سے آشنا ہوکر تسکین حاصل کرے۔ چنانچہ افسانے نے نہ صرف اردو میں بلکہ دنیا کی بیش تر زبانوں کے ادب میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔

اردو میں افسانے کی روایت کا آغاز تراجم سے ہوا اور پھر اس کی پیروی میں یہ روایت روز افزوں ترقی کی جانب گامزن نظر آتی ہے۔ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ اس روایت کو پروان چڑھانے میں ''فنون'' کا بھی حصّہ ہے۔

اردو افسانے میں جب علامتی تحریک کا آغاز ہوتا ہے تو بہت سے افسانہ نگار اس رو میں بہتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ معروف افسانہ نگاروں کو جن کے ہاں علامت ایک خاص انداز سے تشکیل پاتی ہے اور ایک خاص مفہوم کی حامل ہے اس کو چھوڑ کر ایسے افسانہ نگار بھی سامنے آئے جن کے ہاں علامت کی تفہیم ایک چیستان بن جاتی ہے۔ عامر سہیل افسانے میں لایعنی علامتوں سے گریز کا مشورہ دیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

> ''جدید اردو افسانے میں نت نئے تجربات ہوتے رہتے ہیں اور ہونے بھی چاہییں لیکن اگر ان تجربات کا حاصل زندگی سے دوری ہے تو اس سے بہتر ہے کہ ٹھوس روایت ہی کی پاس داری کی جائے۔ ان دنوں ہمارے ہاں واقعاتی افسانوں میں عسیر الفہم علامتوں میں لکھنے کا رواج عام ہے ایسے افسانے قاری کے ذہن میں چیستاں کی صورت میں گھر تو کر لیتے ہیں لیکن ان کے تفکر کو بیدار کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔''[۱۷]

انتظار حسین اردو افسانے کا سنگ میل ہیں۔ افسانہ نگاری میں علامتوں کے استعمال میں ان کو ایک خاص ملکہ حاصل ہے۔ محتاط اندازے کے مطابق یہ کہا جاسکتا ہے کہ علامتوں کی تخلیق کے سلسلے میں انتظار حسین جیسی عمدگی کسی دوسرے افسانہ نگار کے ہاں نظر نہیں آتی۔ ''اختلافات وتاثرات'' میں ان کے افسانے ''وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے'' پر اقبال منہاس نے تنقیدی نگاہ ڈالی ہے اور ان کی

علامتوں یا جوج، ماجوج کو کام یاب علامت قرار دیا ہے۔ یہ ایسی علامت ہے جو آج کے دور پر چسپاں ہوتی ہے اور معانی کی تہہ داری کی وجہ سے ایک لازوال افسانے کی شکل اختیار کرتی ہے۔ اقبال منہاس لکھتے ہیں:

''انتظار حسین کا افسانہ ''وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے'' انتظار حسین کی یہ علامتی کہانی اسلامی اساطیر کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ یاجوج اور ماجوج کا المیہ یہ تھا کہ وہ ایک ہی ماں کی کھوکھ اور ایک ہی باپ کے خون سے جنم لینے کے باوصف اپنی نمائندہ نسلوں کو کرہ ارض پر انسان کی طرح رہنا نہ سکھا سکے۔ وہ لمحے جن کی آغوش میں اس کہانی نے جنم لیا اب وقت کی دہلیز سے پھیل کر قرنوں پرانے ہو چکے ہیں۔ وہ نصیحت آموز اشارے آج بھی زندہ ہیں جن کو بطریق احسن بروئے کار نہ لانے کے جرم کی پاداش میں یاجوج اور ماجوج کو مسلسل عذاب کی اذیتوں میں جھونک دیا گیا۔ انتظار حسین کی کہانی اتفاق اور اتحاد کا درس دیتی ہے۔ خصوصاً ملک کے موجودہ سیاسی حالات کی روشنی میں اس کہانی کی افادیت زیادہ روشن ہو جاتی ہے۔ اور صدیوں پرانے یہ دونوں کردار ہماری ملکی سیاست کے جیتے جاگتے کردار بن جاتے ہیں"۔ ۱۸

ظہیر بابر نے بھی علامتی افسانہ نگاری میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کے افسانے پر تنقید کرتے ہوئے خاور نقوی بتاتے ہیں کہ انھوں نے ایک تاریخی موضوع کو گہری سوچ اور تخلیقی مہارت کی بدولت جدت و انفرادیت سے ہم کنار کیا ہے۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

"ظہیر بابر نے اپنے افسانے "بت کدہ" میں علامتی انداز میں تیسری دنیا کے عوام کے استحصال خاص طور پر استعماری طاقتوں کے زیر اثر مسلمانوں کے انحطاط کی موثر تصویر کشی کی ہے۔ یہ افسانہ خصوصاً برصغیر کے مسلمانوں کے حوالے سے اس تاریخی المیہ کو سامنے لاتا ہے کہ کس طرح سات سمندر پار سے تاجروں کے روپ میں آنے والی قوم نے مسلمانوں کی تہذیب، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی زندگی کو تاخت و تاراج کیا۔ اور سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اسلاف کی قیمتی میراث کو بھی ان سے چھین لیا۔ گویا ایک طرح سے ان کے آباؤ اجداد کی قیمت لگائی اور انھیں ذلیل و رسوا کیا۔ یوں ظہیر بابر نے ایک تاریخی موضوع کو گہری سوچ اور تخلیقی مہارت کی بدولت جدت اور انفرادیت سے ہم کنار کیا ہے"۔ ۱۹

احمد ندیم قاسمی نے اردو میں افسانہ نگاری کی روایت کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پریم چند کے بعد دیہاتی زندگی کی منظر کشی کے حوالے سے ان کے افسانے بہت اہم ہیں۔ وہ ایک ایسے فن کار ہیں جو زندگی کے جذبات کو سمجھتے ہیں۔ سماج کا کھوکھلا پن اور زندگی کی بے اعتدالیاں اور ہیچ رویاں ان کے افسانے میں اتنی خوب صورتی سے دکھائی گئی ہیں کہ کم ہی کسی دوسروں کے ہاں نظر آتی ہے۔ ہارون الرشید نے اپنے خط میں قاسمی کے ایک افسانے ''ہم سفر'' پر تنقید کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

''ایک طویل عرصے کے بعد احمد ندیم قاسمی کا افسانہ دیکھا ''ہمسفر'' ان کے مہین تجربے اور کڑی مشقت کا ایک عکس ہے جس میں ہماری سماجی کج رویاں بے اعتدالیاں اور فریب کی پرچھائیاں جھلکتی ہیں۔ ہمارے ہاں قدم قدم پر جو ایک کھوکھلا پن ہے۔ وہ اس افسانے میں جا بجا دستک دیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ پورا افسانہ شروع سے لے کے اختتام تک ایک مسلسل مکالمے کا آہنگ ہے۔'' ۲۰

نچلے طبقے کی زندگی کو افسانے کا موضوع بنانے والے رفعت مرتضیٰ نے کس طرح افسانے میں مخصوص زبان کا استعمال اور فنی مہارت سے کام لیا ہے۔ خاور نقوی نے اپنے خط میں ان کے افسانے ''جواب'' پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''رفعت مرتضیٰ کا افسانہ ''جواب'' بنیادی طور پر کردار کی کہانی ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار، شادو کا سسر ''اللہ بیلی'' ہے۔ اس کی بہو شادو، اُس سے چوری چھپے ملنے والے شکورے اور اُس کے صاحب کے کردار، بعد میں ابھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ معاشرے کے نچلے طبقے کی نفسیاتی کیفیت کو اس کے کرداروں کی مخصوص زبان میں فنی مہارت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور یہ افسانہ ایک خاص قسم کے کرداروں کی بھرپور عکاسی کرتا ہے"۔ ۲۱

قارئین کے خطوط بعض اوقات کسی افسانے کے اس پس منظر سے بحث کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جس میں وہ تخلیق ہوا ہے۔ ہمارے ہاں سیاسی اور اشرافی طاقت کی رسہ کشی جاری رہتی ہے اور دونوں طاقتیں اپنے آپ کو منوانے کے لیے ایڑی چوڑی کا زور لگا دیتے ہیں۔ کرپشن کا ناسور پوری دیانت کے ساتھ دندناتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اُردو افسانوی روایت میں تقسیمِ ہند کا موضوع بہت اہم ہے اس پر افسانے اور ناول قابلِ ذکر تعداد میں لکھے گئے ہیں اور شاید اب بھی لکھے جاتے رہے ہیں۔ ہندو مسلم فسادات اور دونوں طرف کی آبادی کو جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑا اس حوالے سے واقعات اُردو افسانے کے موضوع بنے ہیں۔ عامر سہیل نے اسی حوالے سے، لکھے گئے، مرزا حامد بیگ کے افسانے پر تنقید کی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں کہ:

> ''ڈاکٹر مرزا حامد بیگ فن افسانہ نگاری کے محقق اور نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی ایک بڑے افسانہ نگار ہیں۔ ان کا حالیہ افسانہ ''کاتک کا ادھار'' ایک ایسے موضوع پر لکھا گیا ہے جو اپنے اندر بے پناہ وسعت رکھتا ہے۔ تقسیم کے بعد مسلم معاشرے کو جن ناگفتہ بہ حالات سے دوچار ہونا پڑا ان کے بارے میں ہمارے ادیبوں، خصوصاً افسانہ نگاروں نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس ''تقسیم'' کی وجہ سے غیر مسلم لوگوں کو سماجی اعتبار سے جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان کی عکاسی کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی گئی۔۔۔۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ افسانہ اسی تناظر میں ایک وقیع کاوش ہے۔ اس میں افسانے کے لیے نیا اور اچھوتا موضوع ڈھونڈ نکالنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ مرزا حامد بیگ نے جس باریک بینی سے ''تقسیم'' پر از سرِ نو نگاہ ڈال کر اپنے لیے ایک جیتا جاگتا موضوع تلاشا ہے اس کے لیے وہ یقیناً مبارک باد کے حق دار ہیں ان کا یہ افسانہ موضوع کی ندرت اور جاذبیت کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہے۔''۲۲

''فنون'' کے اس گوشے میں محض خوبیاں ہی بیان نہیں کی جاتیں بلکہ جہاں اختلافات کی گنجائش ہوتی ہے وہاں بے لاگ تنقید بھی کی جاتی ہے اور قارئین کسی بھی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوتے۔ مسعود مفتی کے افسانے ''ٹائم ایکسپریس'' کو بعض ناقدین ایک علامتی افسانہ قرار دیتے ہیں لیکن ایسے بھی قارئین ہیں جو اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ مثلاً ارشد عروج لکھتے ہیں:

> ''فنون'' میں شامل چند افسانے ایسے بھی تھے جو جمالیاتی اصول اور فنی مقتضیات پر پورا نہیں اترتے۔ مسعود مفتی کا افسانہ ''ٹائم ایکسپریس'' افسانہ کم اور تمثیل زیادہ ہے۔ بہت سے احباب کا خیال ہوگا کہ یہ ایک علامتی افسانہ ہے۔ علامت اور تمثیل کے فرق کو واضح رہنا چاہیے۔ اس قصے میں ماضی قریب کی تاریخ کو ''ٹائم ایکسپریس'' کی

تمثیل سے پیش کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ہم قصہ پڑھتے جاتے ہیں اور سب کچھ ہماری سمجھ میں آجاتا ہے۔ قصے کے انجام پر پہنچ کر ہم بہت کچھ سوچنے پر مجبور نہیں ہوتے کیوں کہ اس قصے کے مصنف نے افسانے کے فنی مقتضیات کو اپنے قصے میں نہیں برتا۔اس کے باوجود ہمیں مصنف نے تاریخ اور تاریخیت سے گہری دل چسپی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔''۲۳

''فنون''میں افسانے کے بعد جس صنف پر زیادہ توجہ دی گئی وہ نظم ہے۔جن شعرا کی نظمیں شائع کی گئیں ان پر قارئین نے اظہار خیال کیا ہے۔''فنون''میں نظم نگاری کی اس روایت نے نہ صرف نظم کو ایک کشادہ راہ پر گامزن کیا بلکہ اس کی آب یاری کے لیے بھی کوششیں کیں۔مختلف شعرا کی نظمیں شاملِ اشاعت کی گئیں اور بعض اوقات شعرا کے نظموں کے انتخاب بھی شامل کیے گئے جس سے نظموں کے رجحانات کو سمجھنے میں آسانی ہوئی۔افتخار مغل نظموں کی اشاعت کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''فنون''۴۲،۴۳ میں شامل نظموں کو دیکھ کر احساس ہوا کہ ہمارے شعراء میں ان عصری مسائل کے تخلیقی ادراک کا حوالہ مستحکم سے مستحکم تر ہوتا جا رہا ہے۔چنانچہ اس شمارے میں ماحول کے حوالے سے کئی نظمیں شامل کی گئیں۔ ان میں گلزار کی نظم''درختوں کا نوحہ''محمود علی محمود کی نظم''شہرِ بے صدا''اسلم طارق کی نظم''ہمیں سورج کا رستہ صاف رکھنا ہے''اور خاقان خاور کی نظم''دھرتی اور اس کے بیٹے''ہیں۔میں یہ نہیں کہتا کہ یہ ماحولیات اور آلودگی کے حوالے سے محض موضوعاتی نظمیں ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ ان میں اکیسویں صدی کے اس سب سے زیادہ''چیلنجنگ''موضوع کی تخلیقی حسیت کسی نہ کسی صورت اجاگر ہوتی ہے۔شاید یہ ماحولیاتی حسیت کا نتیجہ ہی ہے کہ اب''ہوا''ہماری شاعری کا ایک بلیغ استعارہ بنتی جا رہی ہے۔''۲۴

قیصر نجفی نے آفتاب اقبال شمیم اور گلزار کی نظم پر بحث کے دوران نئی ڈکشن کے حوالے سے بات کی ہے۔زندگی میں سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی نئی علامتیں اور استعارے وجود میں آرہے ہیں اور ان کا اظہار بھی نظموں میں ہو رہا ہے۔اس حوالے سے قیصر نجفی لکھتے ہیں کہ:

''آفتاب اقبال شمیم کی مختصر نظم''آنکھ کے روبرو''ایسے لوگوں کی عظمت کا پردہ چاک کرتی ہے جو فرض کر لیتے ہیں کہ وہ بڑے لوگ ہیں۔گلزار کی نظم''رن وے''اکیسویں صدی کی نظم ہے اور سفر حیات کی سائنسی لفظیات اور تلازموں میں تشریح و تعبیر کرتی ہے۔ان کے استعارے، علامتیں، تلازمے، امیجری غرض تمام تر شعری تشکیلات اس عہد کی سب سے بڑی حقیقت سائنس کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں، بلکہ سائنس اور ادب میں ایک نوع کا تعلق قائم کرتی ہیں۔''۲۵

احمد ندیم قاسمی افسانیکے ساتھ نظم میں بھی اہم مقام رکھتے ہیں۔ان کی نظمیں بھی اس فنون کی زینت بنتی ہیں اور ان پر بھی اظہارِ خیال کیا جاتا ہے۔ارشد عروج کی قاسمی کی نظم پر تنقید، اصل میں ایک تاثراتی تنقید کا نمونہ محسوس ہوتی ہے۔وہ رقم طراز ہیں کہ:

''جناب احمد ندیم قاسمی کی نظم''یادکا روزن''بلا مبالغہ ۹۵ء کی بہترین نظموں میں سے ایک قرار پائے گی۔اس نظم میں ایک کہانی مقید ہے۔کہانی کا دھارا، فراز کوہ سے وادی کے نشیب کی طرف بہہ رہا ہے۔اس نظم میں تختی پر پھیلتی

ہوئی گا چنی مٹی اور پھر اس گا چنی مٹی کے بطون سے حرف صوت کے پھیلتے ہوئے سفر کو (جس کا تعلق صرف شاعر کی ذات سے ہے) ساری کائنات پر پھیلتا بکھرتا دکھایا گیا ہے۔ دراصل یہی وہ عمل ہے جو جمود کو مسترد کرتا ہے اور تسخیرِ کائنات کا باعث بنتا ہے۔ دوسری طرف روحانی ترفع کی سطح پر ایک امی کو ورفعنا لک ذکرک کی منزل پر پہنچاتا ہے۔''[۲۶]

احمد ندیم قاسمی کے ہاں نظم کا فنی سفر آگے بڑھتا ہی رہا ہے۔ اُن کا کمال یہ ہے کہ وہ انسان کے فطری جذبوں کو خوب صورتی اور سچائی سے نظم کے قالب میں اتار دیتے ہیں۔ خاور نقوی ان کی نظم ''حواس خمسہ'' کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں کہ:

''احمد ندیم قاسمی نے نظم ''حواس خمسہ'' میں انسان کے فطری جذبوں کو حقیقت پسندی اور سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ندیم صاحب کی ہر نئی تخلیق کو پڑھ کر ایک خوش گوار حیرت ہوتی ہے اور ان کے فن نے کسی منزل کو آخر نہیں سمجھا۔''[۲۷]

تہذیب، اقدار اور وطن کی مٹی سے محبت جمیل ملک کی نظم ''پیوستگی'' میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ یہ نظم اگرچہ آغاز میں بہت عمدہ ہے لیکن نظم کا مجموعی تاثر آخر میں دھیما پڑ جاتا ہے۔ ہارون الرشید، اس نظم پر اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ:

''جمیل ملک کی نظم ''پیوستگی'' اس کلاس کی کہانی ہے جسے اپنے بزرگوں، تہذیب وتمدن، روایات اور مٹی سے گہرا انس ہے۔ یہ وہ کلاس ہے جو کسی بھی قیمت پر اپنی جڑوں اور شناخت سے کنارا نہیں کرتی۔ نظم کا آغاز نہایت گہری محبت سے ہوتا ہے لیکن کلائمیکس کی طرف پہنچتے ہوئے نظم کا عمومی تاثر دھیما پڑنے لگتا ہے۔''[۲۸]

منصورہ احمد کی بہت سی نظمیں ''فنون'' کی زینت بنی ہیں اور ان کی نظموں پر لکھا بھی گیا ہے۔ منصورہ دیگر خواتین شعرا کی بہ نسبت احمد ندیم قاسمی کے زیادہ نزدیک تھیں لہذا انھیں شاعری کے فنی رموز کی تخلیق پر قابل ذکر دست رس حاصل تھی اسی وجہ سے اُنھیں معیاری شاعری تخلیق کرنے کا موقع ملا۔ ہارون الرشید ان کی نظم ''ہم سب خواب میں زندہ ہیں'' پر یہ تبصرہ کرتے ہیں کہ:

''منصورہ احمد کی نظم ''ہم سب خواب میں زندہ ہیں'' بھی زندگی کا وہ صحرا ہے جس کے ایک کونے سے لے کر آخری کونے تک کچھ بھی نظر نہیں آتا ہر طرف دھند اور اندھیروں کے بادل لہراتے ہوئے ملتے ہیں۔ لیکن اس کے اندر انھوں نے ایک امید کا در بھی کھلا رکھا ہے۔ جس سے نظم کا مجموعی تاثر ایک ٹھنڈے جھونکے کی طرح دل سے لپٹ جاتا ہے۔''[۲۹]

منصورہ کی ایک اور نظم ''مجھے میرا ملی تھی'' کے بارے میں شاہد یوسف نے اپنے خیالات لکھتے ہیں کہ:

''فنون''، ۱۱۰ میں منصورہ کی نظم ''مجھے میرا ملی تھی'' انسان کے ازلی اور ابدی دکھ کی بے مثال شعری تمثیل ہے۔ نسل انسانی کی بلا جواز مغائرتوں اور منافرتوں کی کرب انگیز صورت حال کا اپنے جذبہ واحساس اور سوزِ قلب کے لمس سے انھوں نے اس شعری واردات کو ایک معجزے میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ نظم ہر حساس اور ذہین انسان کے ذاتی المیے کی آئینہ دار تو ہے ہی لیکن منصورہ نے اپنی TREATMENT سے اس میں آفاقی اقدار کا عمق اور گہرائی پیدا کر دی ہے۔''[۳۰]

منصورہ احمد کی نظم نگاری سے متعلق افتخار مغل نے ذرا وضاحت کے ساتھ بات کی ہے۔ نظم کی اس شاعرہ کی بابت وہ لکھتے ہیں کہ:

''منصورہ احمد کی نظم پر بات ہونی چاہیے۔اس شاعرہ کے ساتھ میرا تنقیدی رشتہ عجیب دھوپ چھاؤں کا سا رہا ہے۔ مجھے کبھی اس پر غصہ آتا ہے اور کبھی فخر محسوس ہوتا ہے۔میں حیران تھا کہ یہ کیوں ہے،اس بار جناب یوسف حسن کے ایک جملے نے میری اس الجھن کو دور کر دیا۔انھوں نے لکھا ہے کہ''فی الحال جو کچھ محسوس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ انھوں (منصورہ) نے اپنا سفر وہاں سے آغاز کیا ہے جہاں پروین شاکر کی سہل اور سہانی مسافت ختم ہو رہی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ منصورہ سے ہم نے امیدیں ہی بہت زیادہ کی ہیں۔''[۳۱]

''فنون'' نے اردو نظم کی ترویج کے ساتھ شاعری میں دوسری جس صنف کو زیادہ اہمیت دی وہ غزل ہے۔غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جو ہمیشہ سے شاد و آباد ہے اگر چہ بعض نقادوں نے اس کے بارے میں بڑے سخت جملے کہے ہیں لیکن غزل اپنے مزاج کے اعتبار سے ہر دل عزیز صنف ہے۔صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پابہ گل بھی۔ بالکل اسی طرح غزل کی صورت حال ہے۔''فنون'' میں اس دور کے بیش تر غزل گو کا کلام شائع ہوتا رہا ہے اور''اختلافات و تاثرات'' میں ان غزلوں پر بھی تنقیدی بحث ہوتی رہی ہے اور شعرا کی فکر پر بھی۔

''غزل ہماری تہذیب کی سادہ و پرکار تصویر بھی ہے اور غزل ہمارے اجتماعی لاشعور اور ہمارے باطن کی سرگوشی بھی ...اس میں عصری حسیت اور لمحے کی چاپ بڑی واضح سنائی دیتی ہے۔''[۳۲]

اس گوشے میں غزلوں پر جو بحث ملتی ہے۔وہ لمبے چوڑے مقالے کی صورت میں نہیں بلکہ اجمالی جائزے کے طور پر ہے۔ لیکن اس کے باوجود تنقیدی بصیرت کی جھلک اس میں بہت واضح طور پر ملتی ہے۔خاور نقوی نے ضیاء جالندھری کی غزل پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"''ضیاء جالندھری کی موجودہ دور کی غزلیں نظم کے تسلسل کے وصف کے ساتھ فکر و فن کی بلندیوں کو چھوتی دکھائی دیتی ہیں۔ان کی غزل میں حیات و کائنات کے مسائل اور روحانیت گہرے شعور کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔''[۳۳]

اردو شاعری میں قتیل شفائی غزل گو شعرا میں اہم مقام رکھتے ہیں اور ان کی غزلیں بھی "فنون" میں جلوہ گر ہوتی رہی ہیں۔ان کی غزلوں میں تغزل اور نغمیت کی جو موجودگی ہے وہ اعلیٰ درجے کی ہے۔ان کی غزل پر بحث کرتے ہوئے آصف ثاقب اپنے خط میں لکھتے ہیں:۔

''گستاخی پر محمول نہ ہو تو کہوں کہ زمانے کے بعد قتیل کی اچھی غزلیں پڑھیں۔تغزل اور نغمیت کا حسین امتزاج پیدا کرنا قتیل پر ختم ہے۔صد شکر کہ یہ مفروضہ باطل ہوا کہ قتیل کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہا۔قتیل اردو غزل کا سرمایہ افتخار رہے غزل کی تاریخ میں اس کا شمار گنے چنے شعرا میں ہوگا۔''[۳۴]

قتیل شفائی کی غزل مسلسل بحث کا موضوع رہی ہے اور ان کی غزلوں کو ہمیشہ پذیرائی حاصل ہوئی ہے اس کے باوجود آصف ثاقب، قتیل کی غزل کو موضوع بناتے ہیں اور ان کے ایک بڑے غزل گو ہونے کے ساتھ اس کی غزل کی فنی و فکری جہتوں پر

اظہار خیال کرتے ہیں:

''قتیل شفائی کی غزل کی تشکیلات میں زمانوں کے فکری ارتقا اور اختلافات کی صورت گری رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں نظام شعر میں ترجیحات اور التزامات کا جو اخلاص قتیل شفائی کے ہاں آموجود ہوا ہے اس کی مثال آسانی سے نہیں مل سکتی۔ اس عہد کے ہر بڑے شاعر نے کوئی نہ کوئی نئی عظمت رواج دی ہے۔ مگر قتیل شفائی کا اسٹائل اسے فن شعر کی ایک بڑائی عطا کر رہا ہے... قتیل شفائی کو ہر بحر کے جذباتی پس منظر کو تفہیم کا پیش منظر بنا رکھنے کا ملکہ حاصل ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ کڑی سے کڑی بحر کو قتیل نے شیرینی نغمہ کا مقتول بنا کے رکھ دیا ہے۔'' ۳۵

غزل گو شعرا میں احمد مشتاق نے بہت کم لکھا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی غزل بہت معیاری اور اعلیٰ پائے کی ہے۔ جابر علی سید نے اس کی غزل پر اپنے خط میں جو رائے دی ہے وہ یہ کہ مشتاق کے ہاں انفرادیت ہے وہ جذباتی شاعر نہیں بلکہ اس کے ہاں ایک خاص قسم کی جدت ہے۔ جب کہ خالد خواجہ کی غزل رسمی اسلوب کی انفرادیت لیے ہوئے ہے ان کی شاعری پر عامر سہیل نے اپنے خط میں اظہار خیال کیا ہے کہ:

''خالد خواجہ کا مجموعہ کلام ''شہر تمنا'' صوری اور معنوی اعتبار سے خوب صورت اور لائق مطالعہ ہے۔ ان کی غزلوں میں ایک خاص قسم کا تکنیکی تنوع ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جو روایتی اسلوب اور رسمی اظہار و بیان سے پاک ہے۔ فکر و نظر کا بلند شگفتہ اسلوب، صوری جمال اور ادب عالیہ کے گہرے مطالعے نے ان کی غزل کو زندگی کا بلیغ استعارہ بنا دیا ہے۔ خالد خواجہ جیسے کہنہ مشق اور حساس شاعر شعر و سخن کی جادو نگری میں اپنا جادو جگاتے ہیں۔ ان کا یہ شعر تو زبان زد عام ہو چکا ہے۔

ہم ٹوٹ کے کرتے ہیں مری جان محبت
یہ کام کبھی حسبِ ضرورت نہیں کرتے'' ۳۶

احمد فراز کے غزلیں بھی ''فنون'' میں بھی شائع ہوتی رہی ہیں۔ آصف ثاقب اُن کی غزل کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''احمد فراز آج کے مقبول شاعروں میں سے ہیں۔ فراز نے اختراع میں حسنِ شعار، ذوق سلیم اور تصرف حسنہ کا مضمون پیدا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل پڑھ کر غزلیت کی ہمہ گیری محسوس ہونے لگتی ہے۔ وہ علامتوں کی ''ایجاد'' میں حسنِ روایت اور جمالِ جدت کا بہت بڑا آدمی ہے۔'' ۳۷

شہاب صفدر نے بھی اپنے خط میں ''فنون'' میں شائع ہونے والی غزلوں کے متعلق اپنی رائے بھیجی ہیں۔ وہ ''فنون'' کی زینت بننے والے شعرا میں سے چند کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ:

''غزل کے پہلے حصے سے ندیم کے گوہر پارے چننے کے بعد سلطان سکون، خورشید رضوی، حلیم قریشی، شوکت فہمی نصیر احمد ناصر اور دوسرے حصے سے احمد حسین مجاہد، رانا سعید دوستی، شاہین عباسی، حسن عباسی، ناصر حجازی، عادل حیات اور کرن اجالا کے ہاں گہری تخلیقی جرات نظر آئی، اب اپنے اپنے مزاج کی بات ہے ''فنون'' میں شامل غزلیں غیر معیاری تو نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کوئی تخلیق کم سے کم معیار تک آتی ہے تو درج ہوتی ہے۔ اعلیٰ معیار پسند کا

تو پھر اپنا اپنا پیمانہ ہے۔'' ۳۸؎

''فنون'' میں غزل گو شعرا کی شمولیت اور ''اختلافات وتاثرات'' میں شائع شدہ غزلوں پر تاثرات اور اختلافات کم وبیش سبھی شماروں میں نظر آتے ہیں۔غزل کا ہر شعر مکمل اکائی ہوتا ہے لہذا ہر غزل کے ایک ایک شعر پر محدود اوراق میں بحث نہیں کی جاسکتی غزل گو شعرا کے عمومی مزاج اور بعض خوبیوں کی طرف اشارے ہی کیے جاسکتے ہیں اور ان کے بارے میں چند تنقیدی اشارے ہی مناسب معلوم ہوتے ہیں کیوں کہ خطوط بہر حال ان مضامین کی مانند نہیں ہوتے۔تاہم غزل کی روایت کو آگے بڑھانے اور معیار کی بہتری کے لیے ''فنون'' کی یہ کاوش قابلِ قدر معلوم ہوتی ہے۔

گوشۂ ''اختلافات وتاثرات'' میں مزاح نگاری پر بھی قارئین نے اپنے خیالات بھیجے ہیں ان میں انور مسعود کا نام بہت اہم ہے۔اردو شاعری میں اگر چہ مزاح نگاری کی روایت بہت مستحکم اور پرانی ہے۔واعظ سے چھیڑ چھاڑ کا انداز ہو یا مزاحیہ کرداروں کی تشکیل مزاحیہ انداز نرالا معلوم ہوتا ہے۔انور مسعود نے مزاح کے روایتی اسلوب کو نہیں اپنایا۔انھوں نے مزاحیہ شاعری میں اپنا ایک خاص رنگ اور منفرد انداز متعارف کرایا ہے۔خاص طور پر وہ ہماری معاشرتی ناہم واریوں اور بے اعتدالیوں کو خوب صورت انداز میں پیش کرتے ہیں۔انور مسعود کے قطعات کے بارے میں محمد سلیم لکھتے ہیں:

> ''انور مسعود کے قطعات میں جہاں مزاح سے رنگا رنگ پھلجھڑیاں چھوٹتی ہیں وہاں ظاہر داری سے انسانی زندگی میں پیدا ہونے والے ذہنی انتشار، سماجی اونچ نیچ، معاشرتی افتراق اور احساساتی گھٹن، تہذیبی بحران، پرانی اور نئی اقدار کے تصادم کے محرکات کی طرف بھی روشن اشارے ہیں''۔ ۳۹؎

''رباعیاتِ فراق'' کے بارے میں قارئین نے اپنی رائے سے مستفید کیا اور قارئین نے اُن کی رباعیات کے ساتھ غزلیات کا تقابل بھی کیا۔حقیقت یہ ہے کہ فراق کی رباعیات سے حظ حاصل کرنے کے لیے ہندوستان کی ثقافتی اور ادبی روایت سے آشنا ہونا ضروری ہے۔ان کا مجموعہ ''روپ'' شائع ہوا تو انھیں بہتشہرت حاصل ہوئی۔اس سلسلے میں عامر سہیل لکھتے ہیں:

> ''فراق گورکھپوری کا مجموعۂ رباعیات ۱۹۴۶ء میں ''روپ'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ان رباعیات کی جمالیاتی تہذیبی اور ثقافتی خوبیوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا گیا تھا۔''روپ'' کی رباعیوں میں عشق ومحبت کے تجربات، مشاہدات، کیفیات اور جنسی رموز پر اردو ادب کے بلند پایہ ادیبوں اور نقادوں نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ جو غیر معمولی شہرت فراق کی غزل کو ملی کم وبیش رباعیاتِ فراق کے حصے میں اتنی ہی شہرت آئی۔فراق کی رباعیات سے حظ اٹھانے اور راست فہم حاصل کرنے کے لیے ہندوستان کی ثقافتی اور ادبی روایت سے واقف ہونا ضروری ہے۔جب تک اس تناظر میں فراق کی رباعیات کا مطالعہ نہیں ہوگا یہ رباعیات اپنا مفہوم آشکار نہیں کریں گی''۔ ۴۰؎

آصف ثاقب نے رباعی کی تکنیک اور فن کے حوالے سے محمد ارشاد کے مقالے کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔اس سلسلے میں وہ رقم طراز ہیں کہ:

> ''محمد ارشاد کا مقالہ: رباعی، تکنیک اور فن، فنِ رباعی کی تکنیک پر سرمایۂ مطالعہ ہے۔اس میں غزلیت اور رباعیت کی

تفریق خوب آئینہ ہوئی ہے۔ یہ مضمون رباعیت کا تصویر نما ہے۔ اس میں علمیت کے دلربا قرینے باب تفہیم کھولتے ہیں۔ فن رباعی کی ضرورت یہ بھی ہے کہ متعلقہ ارکان کی نشست اس سلیقے سے ہو کہ اگر پہلے رکن کے آخر میں سبب دوحرفی ہے تو لازمی طور پر اس کے بعد آنے والے رکن کے شروع میں سبب موجود ہو اسی طرح اگر وتد (سہ حرفی) آخر پر ہے تو اگلے رکن کے شروع میں وتد ہو۔'' ۴۱؎

متفرق اصناف ادب پر اظہار خیال بھی قارئین کے خطوط میں موجود ہیں۔ سفر نامہ نگاری اور چند سفر نامہ نگاروں کے حوالے سے اس گوشے میں اظہار رائے کا انداز سرسری ہے:

''سلمٰی اعوان ابتدا سے سفر نامے لکھ رہی ہیں۔ دیگر ادبی رسائل میں بھی ان کی سیر بینی سے محظوظ ہوتے رہتے ہیں۔ اب تو ان پر جہاں گشت ہونے کا یقین ہونے لگا ہے۔ بہر حال سادہ بیانیہ انداز میں، کسی تصنع کے بغیر ان کی تحریر کا اپنا لطف ہے۔ ان دیکھی دنیا کا حال سنانا یوں انسان کا پرانا مشغلہ ہے اور اگر اسے داستان کے طلسم کاری بھی میسر آ جائے تو کیف تحیر بڑھتا جاتا ہے۔ ۴۲؎

محمد کاظم، مستنصر حسین تارڑ، عطاالحق قاسمی، ڈاکٹر اجمل اور مسعود اشعر کے سفر نامے بھی ''فنون'' کے اوراق کی زینت بنتے رہے ہیں ان پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے شریف الدین اشرف لکھتے ہیں:

''پھر وہ سفر نامے میں جو ''فنون'' کی خصوصیت بن گئے ہیں۔ ان تین شماروں میں محمد کاظم، مستنصر حسین تارڑ، اور عطاالحق قاسمی کے علاوہ ڈاکٹر اجمل اور مسعود اشعر کے سفر نامے بھی شامل ہیں اور یہ پانچوں سفر نامے اپنے اپنے رنگ میں بے مثال ہیں۔ صرف ڈاکٹر اجمل کا سفر نامہ کہیں کہیں ''اسپشلسٹانہ'' سا ہو گیا ہے مگر یہ ان کی مجبوری ہے آخر وہ نفسیات کے اتنے بڑے عالم ہیں، اگر ایک عالمِ نفسیات اپنے سفر نامے میں نفسیات کے موضوع پر نہیں لکھے گا تو کیا عطاالحق قاسمی کی طرح ان کونوں کھدروں میں جا بیٹھے گا جہاں عالمِ انسانیت اپنے سارے پردے اتار کر اپنی ابتدا کی طرف رجعت کرنا نظر آتا ہے؟ عطاالحق قاسمی کا مطالعہ کتنا شدید حد تک گہرا ہے، بعض مقامات پر تو میں کانپ کانپ گیا اور پھر اس کا دلربا انداز نگارش۔ مستنصر حسین تارڑ تو خیر ایک منجھا ہوا سفر نامہ نگار تو ہے ہی اس کی تحریر میں اتنی جاذبیت ہے اور اس کا انسانی فطرت کا مطالعہ اتنا گہرا اور قریبی ہے کہ اس کا سفر نامہ شروع کرنے سے پہلے میں سارے ضروری کام نبٹا لیتا ہوں کہ ایک بار پڑھنا شروع کر دیا تو پھر مستنصر مجھ غریب کو کہاں جانے دے گا۔ محمد کاظم کے سفر نامے میں جو باوقار متانت اور عمیق مخلصانہ مشاہدہ ہے۔ اس کا جواب نہیں۔ اگست کے شمارے میں ان کے سفر نامے کی قسط پڑھ کر یوں محسوس ہوا جیسے منہ بند کلی چٹک کا غنچہ بن چلا ہے۔ مسعود اشعر صاحب سفر نامہ نگاری میں اور اضافہ ثابت ہوئے ہیں۔ اتنی شگفتگی اور خوش مزاجی اس سے پہلے مجھے صرف عطاالحق قاسمی کے ہاں نظر آئی تھی یا پھر برسوں پہلے محمد خالد اختر کے سفر ناموں میں''۔ ۴۳؎

مقالات اور مضامین جو ''فنون'' میں شائع ہوتے رہے ہیں ان میں بعض اہل قلم کی فکری کاوشوں کی داد دینی پڑتی ہے۔ علی عباس جلال پوری۔ محمد کاظم، محمد ارشاد، افتخار مغل، آصف ثاقب، ہارون الرشید، جابر علی سید، ظفر سپل اور عامر سہیل وغیرہ ہم کے مقالات اعلیٰ پائے کے ہیں۔ ان مقالات پر ''اختلافات و تاثرات'' میں تنقیدی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔ اور اس کے مختلف شماروں

میں سوالات بھی اٹھائے گئے ہیں بلکہ بعض تنقیدی مضامین بھی لکھے گئے ہیں گویا باقاعدہ بحث کی شکل اختیار کر لی اور کئی شمارے ایسی بحث لیے ہوئے ہیں۔

محمد ارشاد کے مقالے ''مجذوب فرنگی'' میں عامر سہیل نے کچھ اعتراضات کیے تو ان کے جواب محمد ارشاد نے دیے۔ یہاں ''مجذوب فرنگی'' سے مراد نیطشے ہے'' اور عامر سہیل نیطشے کے بارے میں یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس کا فر میں ایک وحدت کا رشتہ تلاش کیا جا سکتا ہے جب کہ محمد ارشاد کا خیال یہ ہے کہ نیطشے کو سمجھنا نہایت دشوار ہے۔ اس سلسلے میں وہ رقم طراز ہیں:

> ''عامر سہیل صاحب کو تو واقعی دقت پیش نہیں آتی کہ وہ ارواح کو حاضر کرنے کا علم ''جانتے'' ہیں اور نیطشے کی روح تو مستقل طور پر انھیں کے آستانے پر حاضر رہتی ہے اس لیے نیطشے کے بارے میں ان کا علم براہ راست ہے جب جو چاہتے ہیں پوچھ لیتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کا انحصار نیطشے کے متون پر ہے وہ نیطشے کے افکار میں وحدت کے فقدان اور ان کے عدیم الفہم ہونے کی شکایت کرتے ہیں۔ جب کہ بجا طور پر عامر سہیل کا ''نیطشے کے افکار میں وحدت تلاش کرنا کچھ ایسا مشکل نہیں۔ لیکن وہ یہ بھی تو سوچیں کہ تثلیث کے پجاری نیطشے کے افکار میں ''وحدت کا رشتہ'' تلاش کر بھی کیسے سکتے ہیں نیطشے کے افکار میں ''وحدت کا رشتہ'' تو عامر سہیل سا موحد ہی تلاش کر سکتا ہے'' [۴۴]

عامر سہیل نے محمد ارشاد کے مقالے، رباعی، تکنیک اور فن، پر ''اختلافات و تاثرات'' میں بحث کی ہے۔ انھوں نے خط میں محمد ارشاد کی بعض کمزوریوں کی طرف قارئین کو متوجہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''اپنے مقالے [۱۲۲] میں تلوک چند محروم کی رباعی کو کمزور کہہ کر اس پر اصلاح دے ڈالی ہے اور ''فراق گورکھپوری کی تقریباً رباعیوں میں رباعیت مفقود'' اس بیان سے صرف یہ پتا چلتا ہے کہ انھوں نے فراق کی تقریباً سبھی رباعیاں پڑھ کر پھر یہ حکم لگایا ہے۔ میری طرح اور احباب بھی حیرت زدہ ہوں گے کہ اتنے اعلیٰ ذوق کا انسان اتنا ''مفقود الرباعیت'' رباعیوں کا انبار کیسے پڑھ گیا۔ محمد ارشاد صاحب لکھتے ہیں ''فراق کی کوئی سی چار ہم قافیہ رباعیاں لے کر ان میں سے ایک ایک مصرع لے کر چاروں مصرعوں کو چار مختلف ترتیبوں سے رباعی کے صورت دی جا سکتی ہے'' اور پھر انھوں نے کمال مہارت سے رباعی بنا کر دکھا دی ہے۔ اس نوح کی تبدیلی کم و بیش ہر رباعی گو کی رباعی میں کی جا سکتی ہے۔ غزل، قصیدہ اور مثنوی میں کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑ کے مصداق جو چاہیں بنائیں۔ ان مضحکہ خیز امکانات کی موجودگی سے کون انکار کر سکتا ہے۔'' [۴۵]

تنقید کی روایت کو پروان چڑھانے میں رسائل کا کردار بہت اہم رہا ہے اور خاص طور پر ''فنون'' نے ''اختلافات و تاثرات'' کے ذریعے صلائے عام دی ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قارئین نے بہت آزادی کے ساتھ فکری، فنی موضوعاتی اور تنقیدی حوالوں سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ ایک موقعے پر اشفاق بخاری نے مدرسانہ تنقید کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> ''برٹینڈ رسل نے یونیورسٹی اساتذہ کے بارے میں رقم کیا ہے کہ استاد کے ذہن میں ''مدرسیت'' کے آنے سے تخلیقی سرچشمے خشک ہو جاتے ہیں۔ ن۔م راشد نے ڈاکٹر عبداللہ کے نام ایک خط میں بھی اس قسم کے خیالات کا ظہار کیا ہے، اور اردو کے استاد نقادوں کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ ان کا تنقیدی شعور اورینٹل کالج سے آگے نہیں

بڑھا۔ آپ کسی بھی استاد سے میر، غالب، مومن، ذوق کے بارے میں بات کریں وہ سب تقریباً وہی اشعار سنائیں گے جو ڈاکٹر عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنی کتابوں میں رقم کیے ہیں۔'' ۴۶

''فنون'' کا یہ گوشہ اس لحاظ سے بہت اہمیت کا حامل ہیں کہ ان میں لکھنے والے تمام افراد کا تعلق کسی نہ کسی طرح ادبی دھارے سے ہے اور وہ مختلف اصناف سے ایک خاص دل چسپی رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کی تحریروں میں ایک خاص علمیت پائی جاتی ہے۔ مثلاً تحقیقی معاونت کے اعتبار سے دیکھیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کون سے شاعر یا ادیب نے کون سا فن پارہ کب تخلیق کیا یا وہ پہلی بار کب اشاعت پذیر ہوا اسی طرح بہت سی کتابوں کے بارے میں بھی پتا چلتا ہے کہ وہ کب زیور طباعت سے آراستہ ہوئیں۔ بہت سے لوگوں کی وفیات کا ذکر بھی انھیں صفحات میں موجود ہے جو تحقیقی معاون کے طور پر ایک اہم ذریعہ ہے۔ اسی طرح خالص علمی و تحقیقی معلومات بھی اس گوشے میں موجود ہیں۔ شاعری کے فنی و فکری رموز پر بھی اظہار خیال جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ بعض مفکرین کے بارے میں بھی تحقیقی معلومات کا ذخیرہ انھی صفحات میں فراہم ہوتا ہے۔

لفظی تحقیق کے حوالے سے بھی بہت سی مثالیں بکھری ہوئی ہیں۔ آصف ثاقب نے شعیب آفریدی کی لفظی تحقیق جو ''قدمچہ'' سے متعلق تھی پر بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ:

> ''تازہ ''فنون'' کے اختلافات میں شعیب آفریدی نے لفظ ''قدمچہ'' سے بحث کی ہے۔ انھوں نے لفظ کے حصوں ''قدم اور چہ'' کو الگ الگ لیا ہے۔ اس ضمن میں مزید وضاحت یہ ہے کہ ''قدمچہ'' اسم تصغیر ہے اور ''چہ'' علامت اسم تصغیر باغیچہ اور صندوقچہ بھی اسی قبیل میں آتے ہیں ''چہ'' پر امالہ'' بھی وارد ہوتا ہے۔ مثلاً! وہ شخص باغیچے میں بیٹھا ہے۔ اس صندوقچے میں کیا ہے۔۔ پچھلے صحن میں چند قدمچے لگے ہوئے ہیں۔ تصغیر مزید کے طور پر انھیں باغیچی اور صندوقچی اور قدمچی بھی کہا اور لکھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے علامت اسم تصغیر ''چہ'' میں اور شعیب آفریدی والے ''چہ'' میں نمایاں فرق ہے۔ قدمچہ کی ساخت میں عربی اور فارسی حصے آئے ہیں۔ مگر اس کا استعمال یکسر ہندی ہے۔ لفظ گلاب، گل اور آب سے بنا ہے دونوں حصے فارسی ہیں۔ گلاب کا استعمال ہندی ہے فارسی میں گلاب کے پھول کو گل کہتے ہیں اس وجہ سے بعض اہل فن گلاب کے ساتھ فارسی ترکیب روا نہیں رکھتے اس کے ساتھ فارسی ترکیب لانے والے لفظ کی ساخت کو سامنے رکھتے ہیں۔ ایسے الفاظ اور بھی کئی ہیں جن کی تشکیل یا تو فارسی ہے یا عربی مگر معنوی اعتبار سے ان کا استعمال ہندی ہے۔'' ۴۷

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے بھی لفظی تحقیق کے حوالے سے امجد اسلام امجد کے ''مصحفی'' پر لکھے گئے مضمون کے حوالے سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ امجد کو مصحفی کے بعض الفاظ سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ امجد کے نزدیک وہ الفاظ انگریزی کے ہیں جب کہ ڈاکٹر شیرانی نے اس حوالے سے اُن الفاظ کا استعمال اور ان کے مصادر کا ذکر کر کے تحقیقی رویے کا ثبوت دیا کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ ''اختلافات و تاثرات'' میں لکھتے ہیں۔

> ''...منظومات کے علاوہ محترم امجد اسلام امجد کا مضمون ''مصحفی کے تین دیوان'' دیکھ سکا ہوں۔ اس مضمون میں انھیں ایک چھوٹی سی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' ۴۸

اسی طرح ''فنون'' میں شائع ہونے والی پروین شاکر کی ایک نظم کے ایک مصرعے کے بارے یہ ابہام پیدا ہوگیا کہ کیا یہ مصرعہ شریف کنجاہی کا ہے یا پروین شاکر کا۔ نظم کے شائع ہونے کے بعد خالد احمد نے اس پر اظہارِ خیال کیا جس پر پروین شاکر اور شریف کنجاہی نے وضاحت کی جس سے وہ غلط فہمی دور ہوگئی ہے۔ پروین شاکر لکھتی ہیں:

> ''تازہ شمارے میں جناب خالد احمد نے لکھا ہے کہ میری گزشتہ ماہ کی نظم کا پہلا مصرعہ، شریف کنجاہی صاحب کے لافانی مصرعوں میں سے ایک ہے۔ شریف کنجاہی صاحب اور خالد احمد صاحب میری اس نظم کو میری علمی کم مائیگی کا شاخسانہ سمجھ لیں۔ میں نے کنجاہی صاحب کی وہ نظم یا غزل واقعتاً نہیں پڑھی۔ بہرکیف میں خالد احمد صاحب کی ممنون ہوں کہ انھوں نے میری نظم کو اس کی اصل روح کے ساتھ سمجھا اور مجھے ایک حیرت آمیز توارد سے روشناس کیا۔''۴۹

شریف کنجاہی اسی سلسلے میں مزید وضاحت کرتے ہیں کہ:

> ''فنون'' کے تازے شمارے میں خالد احمد کا وہ جملہ غلط فہمی کا باعث بن سکتا ہے جس میں پروین شاکر کی نظم کے عنوان ''آج کی شب تو کسی طور گزر جائے گی'' کا ذکر کرتے ہوئے اسے میرے ایک مصرعے کے ساتھ توارد کی مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مجھے اس ضمن میں اسی قدر وضاحت کرنا ہے کہ چوں کہ وہ غزل آج تک کہیں چھپی ہی نہیں اور اس کا علم چند عزیزوں کو ہے اس لیے اس سے یہ گمان نہیں گزرنا چاہیے کہ وہ مصرعہ پروین شاکر نے کہیں پہلے پڑھا یا سنا ہوگا۔''۵۰

درج بالا دونوں اقتباسات سے واضح ہوتا ہے کہ توارد کی بنا پر دو شعراء کے ہاں ایک ہی طرح کا مصرع تخلیق پا سکتا ہے۔ لیکن تحقیقی طور پر یہ ثابت ہوگیا کہ یہ توارد ہے نہ کہ سرقہ اور اس سچائی تک پہنچنے میں ہمیں ''اختلافات وتاثرات'' نے معاونت فراہم کی۔

مسلم دانش وروں اور فلاسفے کے حوالے سے بھی ''فنون'' کے صفحات میں تحقیقی مواد موجود ہے جس سے علم ہوتا ہے کہ کن مصنفین نے اس موضوع پر کام کیا ہے۔ اس کے علاوہ تحرکات اور افکار و نظریات کی بابت بھی معلومات ملتی ہے جس سے وہ عظیم لوگ وابستہ رہے۔ خاور نقوی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''مسلم فلاسفہ کے علم و دانش اور اس کے اثرات سے کوئی ذی شعور انکار نہیں کر سکتا۔ ان کی خرد افروزی کی بدولت یورپ نے اپنی جہالت کی تاریکیوں کو علم و حکمت کی روشنیوں میں تبدیل کیا۔ ''اخوان الصفا'' تحقیق و تدقیق اور معرفت و حکمت کی ایک ایسی ہی کڑی کا نام ہے۔ ڈاکٹر آغا افتخار حسین نے اپنی تصنیف ''قوموں کی شکست زوال کا مطالعہ'' میں اس کی طرف بلیغ اشارے کیے ہیں۔ محمد کاظم نے اس تنظیم کے افکار نظریات کو اپنے وقیع مضمون ''اخوان الصفا۔ عباسی دور میں مسلم اہل فکر کی ایک خفیہ تنظیم'' میں تحقیقی بصیرت کے ساتھ بیان کیا ہے۔''۵۱

مجموعی طور پر قارئین کے خطوط پر مشتمل ''اختلافات وتاثرات'' کا یہ حصہ جس میں بے حد معلومات افزا ہے اور ادبی تاریخ کا ایک اہم ماخذ بھی۔ احمد ندیم قاسمی کے بعد ناہید قاسمی اور نیّر حیات قاسمی نے جس انداز سے ''فنون'' کو زندہ رکھا وہ بلاشبہ قابلِ تحسین ہے لیکن یہ صرف ان کی ذمہ داری نہیں بلکہ تمام اہل قلم کی بھی ہے۔ زندہ قومیں اپنی اعلیٰ روایات کو زندہ رکھتی ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ذمہ داری ادیبوں/شاعروں کی ہی ہیں وہی علم و ادب کے پاسبان ہیں۔

حواشی:

۱۔ 'فنون'، لاہور، شمارہ:۱۱۳، مئی، دسمبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۹۰۔
۲۔ ایضاً، شمارہ ۱۱۷، اپریل، اگست ۲۰۰۲ء، ص ۳۲۰۔
۳۔ ایضاً، ص ۳۱۶۔
۴۔ ایضاً، شمارہ ۱۳۴، اپریل، ستمبر ۲۰۱۳ء، ص ۳۲۷۔
۵۔ ایضاً، شمارہ ۶، ۷، اپریل، مئی ۱۹۷۱ء، ص ۱۲۳۔
۶۔ ایضاً، شمارہ ۳۴، اکتوبر دسمبر ۱۹۹۱ء، ص ۳۴۱۔
۷۔ ایضاً، شمارہ ۱۱۳، مئی دسمبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۸۷۔
۸۔ ایضاً، شمارہ ۴۶، جنوری، اپریل ۱۹۹۶ء، ص ۳۱۰۔
۹۔ ایضاً، شمارہ ۱۳۱، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۱ء، ص ۳۹۸۔
۱۰۔ ایضاً، شمارہ ۱۲۳، ستمبر، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۳۱۸۔
۱۱۔ ایضاً، شمارہ ۱۱۳، مئی دسمبر ۲۰۰۰ء، ص ۳۱۶۔
۱۲۔ ایضاً، شمارہ ۱۳۱، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۱ء، ص ۴۰۴۔
۱۳۔ ایضاً، شمارہ ۴۶، جنوری، اپریل ۱۹۹۶ء، ص ۳۲۰۔
۱۴۔ ایضاً، شمارہ ۱۲۳، ستمبر، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۳۰۲۔
۱۵۔ ایضاً، ص ۳۰۲۔
۱۶۔ ایضاً، شمارہ ۱۱۳، مئی، دسمبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۹۵۔
۱۷۔ ایضاً، شمارہ ۴۴، نومبر، دسمبر ۱۹۹۴ء، ص ۲۵۳۔
۱۸۔ ایضاً، شمارہ ۱، ۲ مئی، جون ۱۹۷۰ء، ص ۱۹۸۔
۱۹۔ ایضاً، شمارہ ۴۶، جنوری اپریل ۱۹۹۶ء، ص ۳۱۱۔
۲۰۔ ایضاً، شمارہ ۱۱۲، جنوری تا جون ۲۰۰۰ء، ص ۳۲۰۔
۲۱۔ ایضاً، شمارہ ۱۱۲، مئی دسمبر ۲۰۰۰ء، ص ۳۲۸۔
۲۲۔ ایضاً، شمارہ ۴۴، نومبر، دسمبر ۱۹۹۴ء، ص ۲۵۲۔
۲۳۔ ایضاً، شمارہ ۴۶، جنوری اپریل ۱۹۹۶ء، ص ۳۲۱۔
۲۴۔ ایضاً، شمارہ ۴۴، نومبر دسمبر ۱۹۹۴ء، ص ۲۵۰۔
۲۵۔ ایضاً، شمارہ ۱۲۳، ستمبر دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۳۱۴۔
۲۶۔ ایضاً، شمارہ ۴۶، جنوری اپریل ۱۹۹۶ء، ص ۳۲۰۔
۲۷۔ ایضاً، شمارہ ۴۶، جنوری اپریل ۱۹۹۶ء، ص ۳۱۱۔
۲۸۔ ایضاً، شمارہ ۱۱۲، جنوری، جون ۲۰۰۰ء، ص ۳۲۰۔
۲۹۔ ایضاً، ص ۳۲۱۔
۳۰۔ ایضاً، شمارہ ۱۱۷، اپریل اگست ۲۰۰۲ء، ص ۳۲۶۔
۳۱۔ ایضاً، شمارہ ۴۴، نومبر، دسمبر ۱۹۹۴ء، ص ۳۵۰ء۔
۳۲۔ ایضاً، شمارہ ۴۶، جنوری اپریل ۱۹۹۷ء، ص ۳۲۰۔
۳۳۔ ایضاً، ص ۳۱۱۔
۳۴۔ ایضاً، شمارہ ۵، ۶، اپریل، مئی ۱۹۷۵ء، ص ۱۷۷۔
۳۵۔ ایضاً، شمارہ ۴۴، نومبر، دسمبر ۱۹۹۴ء، ص ۲۵۶۔
۳۶۔ ایضاً، شمارہ ۱۱۷، اپریل اگست ۲۰۰۲ء، ص ۳۳۳۔
۳۷۔ ایضاً، شمارہ ۵، ۶، اپریل مئی ۱۹۷۵ء، ص ۱۷۷۔
۳۸۔ ایضاً، شمارہ ۱۳۶، جولائی ۱۴ مارچ ۲۰۱۵ء، ص ۵۱۳۔
۳۹۔ ایضاً، شمارہ ۵، ۶، اپریل، مئی، ۱۹۷۵ء، ص ۱۷۹۔
۴۰۔ ایضاً، شمارہ ۱۲۳، ستمبر، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۳۰۰۔
۴۱۔ ایضاً، ص ۳۱۷۔
۴۲۔ ایضاً، شمارہ ۱۳۱، جولائی، ستمبر ۲۰۱۱ء، ص ۴۰۵۔
۴۳۔ ایضاً، شمارہ ۵، ۶، اپریل مئی ۱۹۷۵ء، ص ۱۰۱۔
۴۴۔ ایضاً، شمارہ ۴۶، جنوری اپریل ۱۹۹۶ء، ص ۳۰۸۔
۴۵۔ ایضاً، شمارہ ۱۲۳، ستمبر، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۲۹۸۔
۴۶۔ ایضاً، شمارہ ۳۴، اکتوبر دسمبر ۱۹۹۱ء، ص ۳۴۲۔
۴۷۔ ایضاً، شمارہ ۴۷، ۴۸، مئی دسمبر ۱۹۹۶ء، ص ۳۱۶۔
۴۸۔ ایضاً، شمارہ ۱۳۱، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۱ء، ص ۳۹۷۔
۴۹۔ ایضاً، شمارہ ۳، اگست ۱۹۷۴ء، ص ۱۲۰۔
۵۰۔ ایضاً، ص ۱۲۰۔
۵۱۔ ایضاً، شمارہ ۱۱۳، مئی دسمبر ۲۰۰۰ء، ص ۳۲۶۔

فہرستِ اسنادِ محوّلہ:

فنون: مئی تا جون ۱۹۷۰ء، اپریل تا مئی ۱۹۷۱ء، اگست ۱۹۷۴ء، اپریل تا مئی ۱۹۷۵ء، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۱ء، نومبر تا دسمبر ۱۹۹۴ء، جنوری تا اپریل ۲۰۰۰ء، مئی تا دسمبر ۲۰۰۰ء، اپریل تا اگست ۲۰۰۰ء، ستمبر تا اگست ۲۰۰۴ء، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۱ء، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۳ء، جولائی تا مارچ ۲۰۱۵ء۔